Fikr-o-Nasar (Islamabad) 17:1-2 (1979)

قرنیہ کی پیوند کاری کا مسئلہ

مولانا محمد طاسین

میڈیکل سائنس اور طب جدید کی حیرت انگیز ترقی نے جو کرشمے دکھائے ہیں اُن میں سے ایک یہ کہ نابینا آدمی کی آنکھ میں مردہ کی آنکھ کی قرنیہ پیوست کردی جاتی ہے تو وہ بینا ہو جاتا اور خود دیکھنے لگتا ہے اور یہ تجربہ بڑی حد تک کامیاب ثابت ہوا ہے چنانچہ ہر ملک میں ایسے افراد دیکھے جا سکتے ہیں جو پہلے نابینا تھے اور اب بینا ہیں۔ اس چیز کے پیش نظر اب ہر ملک میں یہ ہو رہا ہے کہ بعض لوگ انسانی ہمدردی کے جذبہ سے زندگی میں یہ وصیت کر جاتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد اُن کی آنکھیں نکال کر کسی نابینا کو لگا دی جائیں، اور پھر ہر ملک میں ایسے ادارے قائم ہیں جو یہ خدمت انجام دیتے ہیں، یعنی مرنے والے کی وصیت کے مطابق اس کی آنکھیں اخذ کر لیتے، انہیں خاص طریقہ سے محفوظ رکھتے اور پھر حسب ضرورت نابینا افراد کو لگا دیتے ہیں۔

آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ آنکھوں کی وصیت کے معاملہ میں بدھ مذہب کے لوگ سب سے آگے ہیں سری لنکا میں جہاں زیادہ تر بدھ مذہب کے لوگ ہیں اکثر لوگ ایسی وصیت کر جاتے ہیں اور پھر ان کی وصیت کے نتیجہ میں اتنی زیادہ آنکھیں حاصل ہو جاتی ہیں کہ سری لنکا اپنی ضرورت سے زائد آنکھیں دوسرے ممالک کو بطور عطیہ بھیجتا ہے۔ یورپ اور امریکہ وغیرہ کے عیسائی بھی اب اس خدمت میں کافی حصہ لے رہے ہیں، پوپ اعظم نے تو باقاعدہ اس کے جواز کا اعلان کیا اور عیسائیوں کو اس خدمت میں حصہ لینے کی ترغیب دلائی ہے، لیکن مسلمان اس معاملے میں بہت پیچھے ہیں اور اس کی وجہ یہ کہ مسلمان علماء کے مابین اس مسئلے کے متعلق اختلاف ہے بعض اس کو جائز اور بعض ناجائز کہتے ہیں جس کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے۔

آج سے تقریباً اٹھائیس سال پہلے ۱۹۵۱ء میں مصر کے اندر دارالابصار کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا

جس کا مقصد مردہ انسانوں کی آنکھیں حاصل کرنا اور پھر نابینا افراد کو لگانا تھا، حکومت مصر نے اسے پسند کیا اور اسکی حوصلہ افزائی فرمائی اور ۱۹۵۲ء میں اپنے مفتی اعظم سے پوچھا کہ کیا حکومت کوئی ایسا قانون بنا سکتی ہے جس کے مطابق ہر مرنے والے کی آنکھ اخذ کر کے دارالابصار میں محفوظ کر لی جائیں اور پھر حسب ضرورت نابینا افراد کو لگائی جاتی رہیں، اس کے جواب میں مفتیٔ اعظم نے بطور فتویٰ جو لکھا اس کا حاصل یہ کہ حکومت ایسا کوئی قانون عام تو نہیں بنا سکتی کیونکہ اس سے مرنے والوں کے ورثاء کی طرف سے فتنہ و فساد اُٹھنے کا اندیشہ ہے، البتہ جو مردے لاوارث قسم کے ہوں یا جنہیں سزائے موت مل چکی ہو دارالابصار کے لئے اُن کی آنکھیں اخذ کی جا سکتی ہیں، گویا مفتی صاحب نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا کہ زندہ نابینا آدمی کو لگانے کے لئے مردہ آدمی کی آنکھیں اخذ کی جا سکتی ہیں کیونکہ لاوارث مردہ بھی تو آخر آدمی ہی کا مردہ ہے، یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے ورثاء کی طرف سے اُٹھنے والے مفسدہ کے پیش نظر ہر مردہ کی آنکھیں اخذ کرنے کو جائز نہیں کہا، اسی طرح انہوں نے اس کے بھی جواز کا فتویٰ دیا کہ زندہ نابینا آدمی کو مردہ آدمی کی آنکھیں لگائی جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد کئی دوسرے عرب ممالک کے علماء کرام نے بھی اس کے جواز کا فتویٰ دیا جیسے اُردن اور سعودی عرب وغیرہ۔

لیکن اس کے برخلاف برصغیر پاک و ہند کے علماء کرام نے عموماً اس معاملہ کو ناجائز کہا اور اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیا، اُن کے فتوے کا مطلب یہ کہ نہ کسی مسلمان کے لئے ایسی وصیت کرنا جائز ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری آنکھیں کسی نابینا کو لگانے کے لئے نکال لی جائیں اور نہ ایسی وصیت پر عمل کرنا جائز ہے اور نہ کسی مردہ آدمی کی آنکھیں کسی زندہ آدمی کو لگانا جائز ہے۔

اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ قرنیہ کی پیوندکاری کے مسئلہ میں علماء اسلام کے درمیان اختلاف ہے بعض علماء کے نزدیک یہ معاملہ شرعاً جائز ہے اور بعض کے نزدیک شرعاً ناجائز، اور دونوں فریق اپنے اپنے قول اور موقف کی صحت کے لئے شریعت اسلامیہ کا نام لیتے اور قرآن و حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

اور پھر چونکہ بلحاظ واقعہ یہ ممکن نہیں کہ ایک ہی دین و شریعت میں ایک چیز بیک وقت جائز بھی ہو اور ناجائز بھی کیونکہ یہ کھلا ہوا تضاد ہے جو کسی صحیح دین و شریعت میں نہیں ہو سکتا لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ مسئلہ مذکور میں علماء اسلام کی جو دو متضاد رائیں ہیں ان میں سے ایک بلحاظ واقعہ صحیح اور دوسری ضرور غلط ہے لیکن یہ کہ ان

میں سے کونسی رائے صحیح اور کونسی غلط، اور کونسی اسلام کے مطابق اور کونسی مخالف ہے، اس کا تعین اور فیصلہ ہو سکتا ہے تو صرف اُن دلائل کے علمی تجزیے اور تحقیقی جائزے سے ہی ہو سکتا ہے جو ہر فریق نے اپنی اپنی رائے کے ثبوت میں پیش کئے اور جن پر اس نے اپنے قول اور موقف کی بنیاد رکھی ہے۔

لہٰذا ہم اس مضمون میں فریقین کے دلائل کا بے لاگ جائزہ لینا اور ان کا منطقی تجزیہ پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے حقیقت حال کا صحیح اندازہ ہو سکے اور یہ سمجھنے میں مدد مل سکے کہ دلائل کے لحاظ سے کون سی رائے صحیح اور کونسی غلط ہے۔

تو لیجیے پہلے اُن علمائے کرام کے دلائل ملاحظہ فرمائیے جو قرنیہ کی پیوند کاری کو ناجائز اور حرام کہتے ہیں، ان حضرات کی پہلی اور بڑی دلیل یہ ہے:

پہلی دلیل

کہ چونکہ قرنیہ کی پیوند کاری میں مردہ آدمی کی لاش سے آنکھیں نکالنی پڑتی ہیں اور مردہ آدمی کی لاش میں قطع و برید کا عمل تکریم آدمیت کے منافی اور انسانیت کی ہتک اور توہین ہے، اور چونکہ آدمی کی زندہ ہو یا مردہ تکریم واجب اور ہتک و توہین حرام ہے لہٰذا جو عمل تکریم آدمیت کے منافی اور توہین انسانیت کا موجب ہو وہ حرام اور ناجائز ہے نتیجہ یہ کہ قرنیہ کی پیوند کاری حرام و ناجائز ہے۔

تکریم آدمیت سے متعلق یہ حضرات بطور دلیل قرآن مجید کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۔ الاسراء

(ترجمہ) بے شک ہم نے بنی آدم کو قابل تکریم بنایا اور انہیں خشکی اور تری میں سوار کیا، اور پاکیزہ چیزوں سے ان کو رزق دیا اور اپنی مخلوق میں سے بہت سوں پر انہیں فضیلت و برتری دی۔

اس کی مزید تائید میں کچھ دوسری قرآنی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں جیسے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ سورۃ التین۔

اور بے شک ہم نے انسان کو بہترین شکل و صورت میں پیدا کیا۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۔ وہ اللہ ہے جس نے تمہارے فائدے کے لئے زمین کی سب چیزوں کو پیدا فرمایا۔ (سورۃ البقرہ)

اور توہین مردہ کی تکریم اور ممانعت کے لئے دو حدیثیں پیش کی جاتی ہیں، ایک وہ حدیث جس میں مُثلہ سے منع فرمایا گیا ہے۔ مُثلہ کے معنی ہیں دشمن کو ہلاک کر دینے کے بعد اس کی لاش کو مسخ کرنے کے لئے ناک کان وغیرہ کاٹ دینا تاکہ وہ پہچانا نہ جا سکے اور اس کی مزید تذلیل ہو۔

اور دوسری وہ حدیث جس میں فرمایا گیا ہے کہ کی میت کی ہڈی توڑنا، اور چونکہ زندہ انسان کی ہڈی توڑنا گناہ اور حرام ہے لہذا مردہ انسانی کی ہڈی وغیرہ توڑنا بھی گناہ اور حرام ہے۔

بہتر ہوگا کہ ان حضرات کی دوسری دلیل نقل کرنے سے پیشتر، اس پہلی دلیل کا تحقیقی جائزہ لیا اور منطقی تجزیہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس دلیل سے وہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے یا نہیں جسے ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل پیش کی گئی ہے۔

میں سمجھتا ہوں جو بھی اس میں غور و فکر کرے اور اس کا تحقیقی جائزہ لے وہ ضرور کہے گا کہ اس دلیل سے دعویٰ مذکور نہ صرف یہ کہ ثابت نہیں ہوتا بلکہ الٹا کمزور پڑتا ہے۔

اس دلیل سے دعوۂ مذکور اس وجہ سے ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دلیل دعوے پر چسپاں ہی نہیں ہوتی، منطق کی زبان میں یہ بات اس طرح کہی جا سکتی ہے کہ اس دلیل کے دو مقدمات میں سے ایک مقدمہ صحیح اور دوسرا غلط اور ناقابل تسلیم ہے، یعنی اس کا کبریٰ تو صحیح لیکن صغریٰ غلط ہے لہذا اس دلیل سے اخذ کیا ہوا نتیجہ غلط ہے۔ صغریٰ اس دلیل کا ہے: "اندھے آدمی کی بینائی کی خاطر مردہ آدمی کی آنکھیں اخذ کرنا ایسا عمل ہے جو تکریم بنی آدم کے منافی اور توہین انسانیت کا موجب ہے"۔ اور کبریٰ ہے: "جو عمل تکریم بنی آدم کے منافی اور توہین انسانیت کا موجب ہو وہ حرام اور ناجائز ہے"۔ اور اس کا نتیجہ یہ کہ مردہ آدمی کی آنکھیں اخذ کرنا حرام و ناجائز ہے۔

اس دلیل کا صغریٰ یعنی یہ کہنا کہ اندھے آدمی کی بینائی کی خاطر مردہ آدمی کی آنکھیں اخذ کرنا تکریم بنی آدم کے منافی اور توہین انسانیت کا موجب ہے۔ صحیح نہیں، اور اس کی وجہ یہ کہ تکریم اور توہین کا تعلق دراصل

انسان کے قصد و ارادے سے ہوتا ہے چنانچہ ایک ہی عمل ایک قصد و ارادے سے تکریم کا عمل اور دوسرے قصد و ارادے سے توہین کا عمل قرار پاتا ہے مثلاً وہ تھپڑ جو تادیب کی غرض سے باپ اپنے بیٹے کو اور تعلیم و تربیت کی غرض سے استاذ اپنے شاگرد کو مارتا ہے اُسے نہ تکریم آدمیت کے منافی سمجھا جاتا ہے اور نہ توہین انسانیت کا موجب، لیکن وہی تھپڑ جب ایک دشمن دوسرے کو اذیت پہنچانے اور ذلیل کرنے کی غرض سے مارتا ہے تو اُسے آدمی کی ہتک و توہین سمجھا جاتا اور قابل سزا جرم قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طریقے سے جب ایک ڈاکٹر اس قصد و غرض سے کسی مریض آدمی کا کوئی عضو کاٹ دیتا ہے کہ اس کا باقی جسم محفوظ ہو جائے تو اس کے اس عمل کو نہ آدمیت کی توہین اور نہ کوئی جرم خیال کیا جاتا ہے، لیکن جب وہی عضو کوئی شخص دوسرے کو اذیت پہنچانے اور اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کی غرض سے کاٹتا ہے تو اُسے آدمیت کی ہتک و توہین اور قابل قصاص و دیت جرم باور کیا جاتا ہے۔

ٹھیک یہی حال ایک مردہ آدمی کی لاش میں قطع و برید کا بھی ہے، اگر وہ قطع و برید دشمنی کے جذبے اور محض لاش کو بگاڑنے اور ذلیل کرنے کی غرض سے ہو جیسا کہ مُثلہ میں ہوتا ہے تو یہ یقیناً اسلام کے نزدیک حرام و ناجائز ہے کیونکہ اس میں آدمی کی کھلی ہوئی توہین ہے اور اس سے میت کے ورثاء کو ضرور اذیت پہنچتی ہے، اسی طرح آدمی کی مردہ لاش میں چیر پھاڑ اور قطع و برید کا ایسا عمل جس میں زندہ آدمیوں کا کوئی فائدہ نہ ہو آدمی کی توہین اور حرام و ناجائز عمل ہے اگرچہ وہ عداوت کے جذبے اور لاش کو بگاڑنے کی غرض سے نہ ہو، نیز انسانی لاش کے اندر قطع و برید کا ایسا تصرف جس کا مقصد کسی غیر انسان مثلاً بندر وغیرہ کو فائدہ پہنچانا ہو وہ بھی انسانی توہین کے مترادف اور حرام و ناجائز قرار پاتا ہے۔

لیکن اگر وہ قطع و برید اور چیر پھاڑ کا عمل نفرت و عداوت کے جذبے سے اور لاش کو بگاڑنے اور رسوا کرنے کی غرض سے نہ ہو بلکہ احترام کا احساس کے ساتھ اور دوسرے ضرورت مند آدمی کے فائدہ کے لئے ہو، تو یہ نہ تکریم آدمیت کے منافی قرار پاتا اور نہ توہین انسانیت کی تعریف میں آتا ہے لہٰذا وہ حرام و ناجائز نہیں ہو سکتا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام نے انسان کے میت اور آدمی کی لاش میں بصورت چیر پھاڑ اور قطع و برید کئی ایسی شکلوں کو جائز قرار دیا ہے جن میں زندہ انسانوں کے لئے کوئی فائدہ ہوتا ہے، ذیل میں وہ

شکلیں ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) مردہ ماں کے پیٹ میں زندہ بچہ ہو تو اسے نکالنے کے لئے مردہ ماں کا پیٹ چیرنا جائز ہے۔

۲۔ زندہ ماں کے پیٹ میں مُردہ بچہ ہو اور وہ سوائے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہ نکالا جا سکتا ہو تو اس کے ٹکڑے کر کے نکالنا جائز ہے۔

۳۔ ایسے کنوئیں میں آدمی کی لاش ہو جس کے پانی کی زندہ لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے اور لاش سالم نہ نکل سکتی ہو بلکہ ٹکڑے کر کے ہی نکل سکتی ہو تو اس کے ٹکڑے کر کے نکالنا جائز ہے۔

۴۔ میت کے پیٹ میں کوئی قیمتی پتھر یا سونا ہو جو اس نے زندگی میں نگل لیا تھا تو اسے نکالنے کے لئے اس کا پیٹ چاک کرنا جائز ہے۔

۵۔ بھوکے مضطر آدمی کو جب کھانے کے لئے دوسری کوئی چیز نہ ملے تو وہ مردہ آدمی کا گوشت کاٹ کر بقدر ضرورت کھا سکتا ہے۔

۶۔ غیر طبعی موت کی صورت میں جب موت کا سبب معلوم کرنا ضروری ہو اور لاش کے چیر پھاڑ اور پوسٹ مارٹم کے بغیر ممکن نہ ہو تو چیر پھاڑ کرنا جائز ہے۔

غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہ چھ جزئیے جس قاعدہ کلیہ کے تحت آتے ہیں وہ یہ کہ زندہ آدمیوں کی ایسی ضرورت اور منفعت جو مردہ آدمی کی لاش میں چیر پھاڑ اور قطع و برید کے بغیر پوری نہ ہو سکتی ہو اس کی خاطر آدمی کی مردہ لاش میں چیر پھاڑ اور قطع و برید کا عمل جائز ہوتا ہے۔

اسی طرح مذکورہ فقہی جزئیوں سے ایک یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جو فقہاء کرام ان جزئیوں کے قائل ہیں ان کے نزدیک آدمی کے میت میں چیر پھاڑ اور قطع و برید کا ایسا عمل میت کی توہین و بے حرمتی کے تحت نہیں آتا جو میت کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے زندہ آدمی کی ضرورت کے لئے کیا گیا ہو، غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس عمل کا محرک خود تکریم آدمیت کا جذبہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ کسی زندہ آدمی کی ضرورت کو پورا کرنا در اصل تکریم آدمی کی متعدد شکلوں میں سے ایک شکل ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب مردہ لاش کے اندر قطع و برید اور چیر پھاڑ کا عمل نفرت و تذلیل کے ارادہ سے

اور محض میت کو بگاڑنے اور رسوا کرنے کی غرض سے ہو جیسا کہ مُثلہ میں ہوتا ہے، یا وہ عمل کسی زندہ آدمی کی ضرورت و منفعت کے لئے نہ ہو بلکہ یونہی عبث و فضول ہو جیسا کہ مردہ کی ہڈی توڑنے کی صورت میں ہوتا ہے تو صرف ایسا عمل میت کی ہتک اور بے حرمتی کی تعریف میں آتا ہے جو شرعاً حرام و ناجائز ہے۔

اور چونکہ مسئلہ زیر بحث میں میت کی جو آنکھیں لی جاتی ہیں وہ نفرت و عداوت کے جذبے سے اور میت کو بگاڑنے اور رسوا کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ میت کا احترام کرتے ہوئے اس غرض سے لی جاتی ہیں کہ اندھے آدمی کی ضرورت پوری ہو اور وہ بینائی پاکر عزت نفس اور خودداری کے ساتھ زندگی گزار سکے اور دوسروں کا محتاج نہ رہے، لہٰذا یہ چیز تکریم آدمیت کے منافی قرار پاتی ہے اور نہ توہین انسانیت کی مصداق بلکہ تکریم آدمیت کی مصداق ہوتی ہے۔

اس مذکورہ تفصیل سے یہ ثابت ہوا کہ دلیل مذکور کا صغریٰ صحیح نہیں بلکہ غلط اور باطل ہے لہٰذا اس دلیل سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اندھے آدمی کی بینائی کی خاطر مردہ آدمی کی آنکھیں اخذ کرنا حرام و ناجائز ہے بھی غلط اور باطل ہے۔ غرضیکہ قرآن مجید کی مذکورہ آیات اور دو مذکورہ احادیث سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زیر بحث مسئلہ میں مردہ آنکھیں اخذ کرنا حرام و ناجائز ہے اس لئے کہ جو چیز تکریم آدمیت کے منافی ہی نہیں اُسے تکریم بنی آدم والی آیت سے کیسے حرام و ناجائز ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جو چیز مُثلے کی تعریف میں ہی نہیں آتی اُسے مُثلے کی ممانعت والی حدیث سے کیسے ممنوع و ناجائز قرار دیا جا سکتا ہے! اسی طریقہ سے جو چیز ہڈی توڑنے کے مفہوم و مطلب ہی میں نہیں آتی اُسے میت کی ہڈی توڑنے کی ممانعت والی حدیث سے کیونکر حرام و ناجائز ثابت کیا جا سکتا ہے۔!

دوسری دلیل

اب اُن حضرات کی دوسری دلیل ملاحظہ فرمایئے جو قرنیہ کی پیوندکاری کو حرام و ناجائز کہتے ہیں دراصل اس دوسری دلیل کا تعلق اس دعوے سے ہے کہ کوئی مسلمان ایسی وصیت نہیں کر سکتا کہ اُس کے مرنے کے بعد اس کی آنکھیں کسی نابینا آدمی کو لگا دی جائیں اور وہ دلیل یہ کہ چونکہ کوئی آدمی اپنے جسم کا مالک نہیں لہٰذا وہ اپنے جسم کے کسی عضو کے متعلق وصیت نہیں کر سکتا کیونکہ وصیت کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز کے متعلق وصیت کی جائے وہ آدمی کی ملکیت میں ہو۔

اور اس کے ثبوت میں کہ کوئی آدمی اپنے جسم کا مالک نہیں صرف وہ حدیث نبوی پیش کی جاتی ہے جس میں خودکشی کی ممانعت ہے۔ اس حدیث سے استدلال اس طرح کیا گیا ہے کہ اگر انسان اپنے جسم کا مالک ہوتا تو اس کا اپنے آپ کو قتل کرنا، قابل عذاب جرم نہ ہوتا لیکن خودکشی والی حدیث یہ بتلاتی ہے کہ اپنے آپ کو قتل کرنا عظیم گناہ ہے جس پر آخرت میں شدید عذاب ہوگا، لہٰذا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوئی انسان اپنے جسم و جان کا مالک نہیں جب مالک نہیں تو جسم کے کسی حصہ اور عضو کے متعلق وصیت کیسے کر سکتا ہے اور چونکہ آنکھیں بھی جسم کا ایک عضو اور حصہ ہیں لہٰذا اُن کے متعلق بھی وصیت نہیں کر سکتا۔

آئیے اب اس دوسری دلیل کا تحقیقی جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ اس سے وہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے یا نہیں جسے ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل پیش کی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حدیث مذکورہ سے یہ ضرور ثابت ہے کہ خودکشی حرام اور قابل عذاب جرم ہے جس سے ایک مسلمان کو ضرور بچنا چاہئے لیکن اس حدیث میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ خودکشی اس وجہ سے حرام ہے کہ انسان اپنے جسم و جان کا مالک نہیں، حدیث زیر بحث کے الفاظ یہ ہیں۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من تردّیٰ من جبل فقتل نفسہ فھو فی نار جہنم یتردّیٰ خالدا مخلدا ابدا فیہا، ومن تحسّیٰ سمّا فقتل نفسہ فسمہ فی یدہ یتحساہ فی نار جہنم خالدا مخلدا فیہا، ومن قتل نفسہ بحدیدہ فحدیدتہ فی یدہ یتوجاہ بہا فی بطنہ فی نار جہنم خالدا مخلدا فیہا ابدا۔ کتاب الطب۔ صحیح البخاری۔

ترجمہ: حضرت ابوھریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے پہاڑ سے گر کر اپنے آپ کو قتل کیا وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ اس طرح گرتا رہے گا، جس نے زہر کا گھونٹ پی کر اپنے آپ کو قتل کیا وہ زہر اس کے ہاتھ میں ہوگی اور وہ اُسے جہنم میں ہمیشہ پیتا اور مرتا رہے گا، جس نے کسی تیز دھار کے ہتھیار مثلاً چھری، خنجر اور تلوار وغیرہ سے اپنے آپ کو قتل کیا، جہنم کے اندر وہ ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ اُسے ہمیشہ ہمیشہ اپنے پیٹ میں گھونپتا اور خود کو قتل کرتا رہے گا۔

بہرحال اس حدیث نبوی میں اس کا تو صاف ذکر ہے کہ خودکشی گناہ اور حرام ہے لیکن اس کا کوئی ذکر نہیں کہ

خودکشی کیوں حرام ہے، خودکشی کے حرام ہونے کی یہ توجیہہ کہ انسان اپنے جسم وجان کا مالک نہیں بعض شارحین کے ذہن کی پیداوار ہے، اور یہ اس وجہ سے غلط ہے کہ اس سے قرآن وحدیث کی بکثرت نصوص کی نفی ہوتی ہے جو اس پر دلالت کرتی ہے کہ انسان اپنے جسم وجان کا مالک ہے۔

خودکشی کے حرام ہونے کی صحیح توجیہہ یہ ہے کہ خودکشی کرنے والا چونکہ اپنے اختیار سے اُن لوگوں کے لئے دکھ اور اذیت کا باعث بنتا ہے جن کے ساتھ اس کا باپ، بیٹے، بھائی، شوہر، چچے، بھتیجے، دوست اور پڑوسی وغیرہ کا رشتہ اور تعلق ہوتا ہے اور جن کو اس کی موت سے ضرور رنج وصدمہ پہنچتا ہے، اسی طرح وہ خودکشی کرکے اُن حقداروں کے حقوق تلف کرتا اور انہیں ضرر پہنچاتا ہے جن کے مختلف حیثیات سے اُس کے ذمہ پر حقوق ہوتے اور اس کی موت سے وہ تلف ہوجاتے ہیں اور انہیں ضرور نقصان پہنچتا ہے، بلاشبہ یہ سب کچھ طبعی موت سے بھی ہوتا ہے لیکن چونکہ طبعی موت اس کے اختیار سے نہیں ہوتی لہٰذا وہ قصوروار اور گنہگار نہیں ٹھہرتا، اور چونکہ اپنے اختیار سے دوسروں کو دکھ واذیت دینا اور حق تلفی کرکے اُن کو ضرر ونقصان پہنچانا، شرعاً اور عقلاً حرام ہے لہٰذا خودکشی حرام اور قابل عذاب گناہ ہے۔

غور کیجئے اور بتلائیے کہ خودکشی کے حرام ہونے کی یہ توجیہہ قابل فہم، معقول اور قابل قبول ہے یا وہ توجیہہ جو اُوپر نقل کی گئی ہے یعنی یہ کہ آدمی اپنے جسم وجان کا مالک نہیں لہٰذا وہ خودکشی کرکے غیر کی ملکیت میں ظالمانہ تصرف کرتا ہے جو حرام ہے، اس توجیہ کی اُس صورت میں ضرور گنجائش نکل سکتی تھی جب قرآن وحدیث کی کسی دوسری نص میں اس کی صراحت ہوتی کہ انسان اپنے جسم وجان کا مالک نہیں لیکن نہ صرف یہ کہ اس قسم کی کوئی نص نہیں بلکہ اس کے خلاف بکثرت ایسی نصوص موجود ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان دوسری چیزوں کی طرح اپنے جسم وجان کا بھی مالک ہے اور اس میں ہر وہ تصرف کرسکتا ہے جو خود اس کے اور دوسروں کے لئے دنیا وآخرت میں مفید اور نفع بخش ہو۔

یہاں ضروری ہے کہ انسانی ملکیت کے مفہوم ومطلب پر کچھ بحث کی جائے اور یہ واضح کیا جائے کہ انسان کس طرح سے کسی چیز کا مالک ہوتا ہے اور اپنی مملوکہ چیز میں تصرف کرسکتا ہے۔

مسئلہ ملکیت سے متعلق جب ہم قرآن وحدیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے جو حقیقت ہمارے

سامنے آتی ہے وہ یہ کہ کائنات کی ہر شے کا اصل حقیقی اور دائمی مالک صرف اللہ ہے جس نے ہر شے کو پیدا کیا اور وجود بخشا اور جو ہر شے کی پرورش و نگہداشت فرما رہا ہے، گویا خالق اور رب ہونے کی وجہ سے صرف اللہ ہی ہر شے کا مالک ہے، ہر شے میں چونکہ انسان اور اس کا جسم بھی شامل ہے لہذا دوسری تمام اشیاء کی طرح اس کا بھی حقیقی مالک صرف اللہ تعالےٰ ہے۔ اللہ تعالےٰ کی ملکیت کا مطلب یہ کہ اللہ تعالےٰ کو ہر شے کے اندر ہر قسم کے تصرف کا ذاتی، کلی اور دائمی اختیار ہے اور اُس کے کسی تصرف پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں۔ ایک مسلمان کے لئے جس طرح اللہ تعالےٰ کی دوسری صفات پہ ایمان لانا اور ایمان رکھنا ضروری ہے اسی طرح اللہ کی اس صفت مالکیت پر بھی ایمان ضروری ہے ورنہ وہ کبھی مومن نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالےٰ کی ملکیت کا جو مطلب ہے اس لحاظ سے دوسرا کوئی شے کا مالک نہیں نہ انسان اور نہ جن و ملک۔ ایک انسان کے کسی شے کے مالک ہونے کا جو مطلب ہوتا ہے وہ یہ کہ اُس انسان کو دوسرے انسانوں کی بہ نسبت اس شے سے فائدہ اٹھانے کے حق میں ترجیح و تخصیص حاصل ہے، اور پھر ایک انسان کو دوسرے انسانوں کی بہ نسبت کسی شے سے انتفاع و استفادہ کے حق میں جو ترجیح و تخصیص حاصل ہوتی ہے وہ مخصوص شرعی اسباب کی بنا پہ حاصل ہوتی ہے اور چونکہ یہ اسباب قابل زوال ہوتے ہیں لہذا ان کی بنا پہ حاصل شدہ ترجیح و تخصیص یعنی ملکیت بھی قابل زوال ہوتی ہے دائمی نہیں ہوتی، اسی طرح انتفاع و استفادے کا یہ حق انسان کو اللہ تعالےٰ مالک حقیقی کی طرف سے عطا کردہ ہوتا ہے لہذا انسان کی ملکیت حقیقی نہیں ہوتی بلکہ مجازی ہوتی ہے، نیز انسان کو اپنی مملوکہ شے میں ہر تصرف کا کلی اختیار نہیں ہوتا بلکہ صرف اُن تصرفات کا اختیار ہوتا ہے جو اس کے لئے مفید ہوتے اور دوسروں کے لئے مضر نہیں ہوتے لہذا انسان کی ملکیت اس لحاظ سے کامل نہیں ناقص ہوتی ہے۔ غرضیکہ کسی شے کے متعلق ایک انسان کی ملکیت اللہ تعالےٰ کی بہ نسبت نہیں بلکہ دوسرے انسانوں کی بہ نسبت ہوتی ہے اسی طرح وہ ملکیت ازلی و ابدی نہیں بلکہ عارضی اور قابل زوال اور قابل انتقال ہوتی ہے، نیز وہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے عطا کردہ اور محدود تصرفات کے لئے ہوتی ہے لہذا حقیقی اور کامل نہیں بلکہ مجازی اور ناقص ہوتی ہے۔

بنا بریں ایک چیز بیک وقت اللہ کی ملکیت بھی ہوتی ہے اور ایک انسان کی ملکیت بھی کیونکہ دونوں کا معنی و مطلب الگ الگ ہے لہذا وہ ایک ساتھ جمع ہو سکتی ہیں، انسان کی ملکیت سے اللہ کی ملکیت اور اللہ کی ملکیت

سے انسان کی ملکیت کی نفی نہیں ہوتی جبکہ اس کے برخلاف دو انسانوں کی مستقل و منفرد ملکیت ایک شے میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ دونوں انتفاع و استفادے کے محتاج ہوتے ہیں اور جب ایک کو اس شے سے انتفاع و استفادے میں تخصیص و ترجیح ہوگی تو دوسرے کو نہیں ہو سکتی۔

قرآن مجید میں اللہ تعالٰے نے ہر انسان کو اپنے مال اور اپنے جسم و جان کا مالک ٹھہرایا اور اسے ہر ایسے تصرف کا حق اور اختیار دیا ہے جس میں اس کا دینوی اُخروی اور مادی و روحانی فائدہ ہو اور دوسروں کا ضرر و نقصان نہ ہو، یعنی ایسے کسی تصرف کا اختیار نہیں دیا جو اس کی ذات کے لئے اور دوسرے انسانوں کے لئے مضر اور نقصان دہ ہو، اور اس چیز کو حرام و ناجائز ٹھہرایا ہے کہ کوئی شخص دوسرے کی رضامندی کے بغیر اس کے مال اور اس کے جسم و جان میں مالکانہ تصرف کرے۔

قرآن مجید کی چھیاسٹھ آیات میں جس طرح اموال کی نسبت و اضافت انسانوں کی طرف کی گئی ہے اسی طرح ستر سے زیادہ آیات میں جانوں، جسموں اور جسم کے مختلف اعضا مثلاً ہاتھوں، پیروں، زبانوں، آنکھوں، کانوں وغیرہ کی نسبت و اضافت بھی انسانوں کی طرف کی گئی ہے یعنی جس طرح اَمْوَالُهُمْ وَ اَمْوَالُكُمْ فرمایا اسی طرح اَنْفُسَهُمْ، اَجْسَامُهُمْ، اَيْدِيهِمْ، اَرْجُلِهِمْ، وُجُوهِهِمْ، اَفْوَاهِهِمْ، صُدُورِهِمْ، ظُهُورِهِمْ، اَعْنَاقِهِمْ، اَبْصَارِهِمْ، اٰذَانِهِمْ، رُءُوْسِكُمْ، اَصَابِعَهُمْ، اَعْقَابِكُمْ بھی فرمایا۔ اور پھر جس طرح اموالھم کی اضافت اموال کی ملکیت پر دلالت کرتی ہے اسی طرح مذکورہ تمام چیزوں کی اضافت بھی ملکیت پر دلالت کرتی ہے، نیز جس طرح اللہ تعالٰی نے مال کے اندر انسان کے بعض تصرفات کو جائز اور بعض کو ناجائز ٹھہرایا ہے اسی طرح جسم اور اعضائے جسم کے اندر بھی بعض تصرفات کو جائز اور بعض کو ناجائز ٹھہرایا ہے، پھر جس طرح مال کے اندر جائز تصرفات پر انسان کے لئے اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ہے مثلاً صدقہ، انفاق فی سبیل اللہ، قرض حسنہ جیسے تصرفات پر اسی طرح جسم و جان کے جائز تصرفات پر بھی اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔ جیسے راہ خدا میں غلبۂ حق کی خاطر قتال جس میں انسان زخم بھی کھاتا اور بعض دفعہ جان بھی دے دیتا ہے، یا جیسے کسی اپاہج اور معذور کو راحت پہنچانے کے لئے خود جسمانی مشقت اٹھانا، اور کسی مظلوم کی حمایت میں اپنی جان تک لگا دینا وغیرہ اللہ تعالٰے کے نزدیک اعلیٰ درجے کے نیک کام ہیں اور ان پر انسان عنداللہ اجر و ثواب کا مستحق قرار پاتا ہے۔ نیز جس طرح مال کے اندر ناجائز تصرفات

پر سزا و عذاب کی دھمکی اور وعید ہے جیسے اسراف و تبذیر کہ جس میں مال فضول ضائع ہوتا ہے ایسے ہی جسم کے اندر بھی ناجائز تصرفات پر عذاب و عقاب کی خبر ہے جیسے خودکشی وغیرہ۔

اور پھر جبکہ مال کے اندر جائز تصرفات پر انسان مدح و تعریف اور اجر و ثواب کا مستحق اس وجہ سے قرار پاتا ہے کہ وہ مالک ہوتے ہوئے اپنا مال راہ خدا اور مصارف خیر میں خرچ کرتا ہے تو جسم و جان کے جائز تصرفات پر مستحق اجر و ثواب ہونے کی وجہ یہ کیوں نہ سمجھی جائے کہ انسان اپنے جسم و جان کا مالک ہوتا ہے ؟ اسی طریقہ سے جب مال کے اندر بعض تصرفات کو ممنوع اور موجب سزا و عذاب قرار دینے سے ملکیت مال کی نفی نہیں ہوتی تو پھر جسم و جان کے اندر بعض تصرفات مثلاً خودکشی کو ممنوع اور موجب عذاب قرار دینے سے ملکیت جسم و جان کی کیسے نفی ہو سکتی ہے ؟

قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ بے شک اللہ نے خرید لیا مومنوں سے اُن کی جانوں اور اُن کے مالوں کو بعوض اس کے کہ اُن کے لئے جنت ہے۔ یعنی جنت کے بدلے اللہ نے مومنوں کی جانوں اور ان کے مالوں کا سودا کر لیا۔

اور چونکہ یہ ظاہر ہے کہ خریدی اور بیچی وہی چیز جاتی ہے جو خریدنے اور بیچنے والے کی ملکیت میں ہوتی ہے لہٰذا آیت مذکورہ سے مالوں اور جانوں دونوں کے متعلق انسان کی ملکیت ثابت ہوتی ہے۔ تعجب ہے کہ بعض لوگ اس آیت کو نفی ملکیت کے لئے پیش کرتے ہیں جبکہ اس سے ملکیت کا قطعی اثبات ہوتا ہے اور وہ اس آیت کے صحیح مفہوم و مطلب کو نہیں سمجھتے جو اس کے سوا کچھ نہیں کہ مومنوں کو یہ سمجھتے ہوئے اپنی جانیں اور اپنے مال راہ خدا میں قربان اور صرف کر دینے چاہئیں کہ انہیں اس کے عوض جنت کی ابدی زندگی ملے گی گویا یہ معاملہ بندۂ مومن وہ اللہ کے درمیان طے ہو چکا ہے۔

اسی طرح قرآن و حدیث میں ارش اور دیت کے متعلق جو نصوص ہیں اُن سے بھی یہی ظاہر اور ثابت ہوتا ہے کہ آدمی اپنے جسم اور جسمانی اعضاء کا خود مالک ہے کیونکہ ارش اور دیت نام ہے اُس مال کا جو جسم اور اُس کے کسی تلف شدہ عضو کا بدل اور عوض ہوتا ہے جو قتل کی صورت میں قاتل کی طرف سے مقتول کے ورثاء کو ملتا ہے جب وہ دیت پر راضی ہو جاتے ہیں، اور کسی عضو کے تلف ہو جانے کی صورت میں تلف کرنے والے کی طرف سے اُس شخص کو ملتا ہے

جس کا عضو تلف ہو گیا ہوتا ہے، احادیث نبویہ کے مطابق قتل عمد کی دیت و خون بہا ایک سو اونٹ یا ۱۰ ہزار درہم ہیں، اور جسم کے اعضاء میں سے بعض کی ارش اور دیت کامل ہے، بعض کی نصف، بعض کی چوتھائی اور بعض کی پوری دیت کا دسواں حصہ ہے جیسے ایک انگلی کی دیت دس اونٹ ہیں۔

چونکہ بدل اور معاوضہ انسان اُسی چیز کا لے سکتا ہے جس کا وہ مالک ہوتا ہے لہٰذا دیت کا مشروع ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ انسان اپنے جسم و جان کا مالک ہے، اگر وہ مالک نہ ہوتا تو تلف کئے جانے کی صورت میں وہ اُس کے بدل و عوض یعنی دیت اور ارش کا مستحق نہ قرار پاتا۔

غرضیکہ قرآن اور حدیث میں جو مالی اور بدنی احکام ہیں انہیں غور سے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام مال اور جان دونوں کے متعلق انسان کی ملکیت کو تسلیم کرتا اور اس کی بنیاد پر احکام دیتا ہے اور یہ ملکیت ایک انسان کی دوسرے انسان کی بہ نسبت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کی بہ نسبت نہیں ہوتی جو ہر چیز کا بمعہ انسان کے حقیقی اور دائمی مالک ہے لہٰذا خودکشی کے حرام و ممنوع ہونے کی توجیہہ کرنا کہ انسان اپنے جسم و جان کا مالک نہیں قرآن و حدیث کی بکثرت نصوص اور منشاء شریعت کے خلاف ہے بلکہ اُس کی صحیح توجیہہ وہ ہے جو پیچھے عرض کی گئی اس لئے کہ وہ احکام شریعت کے عین مطابق اور قرین عقل ہے۔

اور چونکہ ان حضرات کی دوسری دلیل کا تانا بانا یہ تھا کہ آدمی اس وجہ سے اپنی آنکھوں کی وصیت نہیں کر سکتا کہ وہ اُن کا مالک نہیں، اور مالک نہ ہونے کی دلیل یہ کہ ایک حدیث نبوی ؐ میں خودکشی کو حرام و ممنوع فرمایا گیا ہے اور خودکشی کے حرام و ممنوع ہونے کی وجہ یہ کہ انسان اپنے جسم و جان کا مالک نہیں، لہٰذا یہ ثابت ہو جانے سے کہ انسان خود اپنے جسم و جان کا مالک ہے دلیل مذکور کا پورا تانا بانا ٹوٹ جاتا اور وہ بے جان اور بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے اور اس سے مدعا ثابت نہیں ہوتا جسے ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل پیش کی گئی ہے۔

پھر اگر ان حضرات کے نزدیک مال کی وصیت جائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انسان مال کا مالک ہوتا ہے تو پھر یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ انسان اپنے جسم اور اعضاء جسم کا بھی مالک ہے جسم کے کسی عضو مثلاً آنکھ کے متعلق اس کی وصیت جائز ہونی چاہیئے اور انہیں اس کے جواز کا قائل ہونا چاہیئے۔

یہاں اگر یہ کہا جائے کہ مال کی وصیت تو اس لئے جائز ہے کہ مال کی وصیت کے متعلق قرآن و حدیث میں

واضح ہدایت ہے جبکہ آنکھوں وغیرہ کی وصیت کے متعلق کوئی ہدایت موجود نہیں لہٰذا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آنکھوں وغیرہ کی وصیت جائز نہیں، اگر جائز ہوتی تو مال کی وصیّت کی طرح قرآن و حدیث میں اس کا بھی ضرور ذکر ہوتا۔

تو اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ قرآن و حدیث میں مال کی وصیت کا ذکر اس وجہ سے ہے کہ نزول قرآن اور ظہور اسلام کے وقت مال کی وصیت کا مسئلہ موجود تھا اور لوگ مال کی وصیّت کرتے تھے البتہ اس کی بعض صورتیں اسلامی نقطۂ نظر سے غلط تھیں لہٰذا قرآن و حدیث میں بعض قیود و شرائط کے ساتھ اُسے جائز قرار دیا گیا، مثلاً وصیت پورے مال کے ایک تہائی تک ہونی چاہیئے اور وارث کے لئے نہیں ہونی چاہیئے، بخلاف آنکھوں وغیرہ کی وصیّت کے کہ اس زمانے میں یہ مسئلہ کہیں موجود ہی نہ تھا، یہ تو اُن مسائل میں سے ایک ہے جو چودھویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے لہٰذا قرآن و حدیث میں اس کے ذکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں قرآن و حدیث میں کسی چیز کے جواز کا صراحۃً ذکر نہ ہونا اس کے عدم جواز کی دلیل نہیں بن سکتا ورنہ بے شمار ایسے مسائل کو ناجائز کہنا پڑے گا جن کا قرآن و حدیث میں صراحۃً ذکر نہیں لیکن ائمہ مجتہدین اور فقہائے کرام نے قیاس کی بنا پر انہیں جائز کہا ہے اور جمہور امت کا ان کے جواز پر اتفاق ہے، اسی طرح اگر قرآن و حدیث میں آنکھوں کی وصیّت کا صراحت کے ساتھ ذکر نہیں تو یہ اس کے عدم جواز کی دلیل نہیں بن سکتا۔

اہل علم جانتے ہیں کہ عہد صحابۂ کرام سے لے کر اب تک یہی ہوتا رہا ہے کہ جب بھی کوئی نیا مسئلہ پیدا ہوا جس کے متعلق قرآن و حدیث میں صریح طور پر کوئی حکم مذکور نہ تھا تو علماء کرام نے قیاس کے طریقے سے اُس کا حکم معلوم کیا یعنی انہوں نے پوری توجہ سے یہ دیکھا کہ قرآن و حدیث میں اس مسئلہ سے ملتا جلتا کوئی دوسرا مسئلہ مذکور ہے یا نہیں جب ایسا مسئلہ مل گیا تو انہوں نے اس غیر مذکور مسئلے کو مذکور مسئلے پر قیاس کیا یعنی جو حکم اُس مسئلہ مذکور کا تھا وہی حکم انہوں نے مسئلہ غیر مذکور کے لئے ثابت کیا، اگر وہ جائز تھا تو اس کو جائز اور ناجائز تھا تو اس کو بھی ناجائز کہا، اس طرح کتب فقہ و فتاویٰ میں قیاسی احکام کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا جو منصوص احکام سے کہیں زیادہ ہے۔

چونکہ زیر بحث آنکھ کی وصیت کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے جس کے متعلق قرآن و حدیث میں کوئی صریح حکم نہیں ملتا لہذا اس کا شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے قیاس ہی کا طریقہ ہو سکتا ہے، اس بارے میں جب ہم قرآن و حدیث پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس مسئلہ سے ملتا جلتا ایک دوسرا مسئلہ مل جاتا ہے اور وہ ہے مال کی وصیت کا مسئلہ، لہذا ہم اس پر قیاس کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح کوئی شخص اپنے مال کی وصیت کر سکتا ہے اسی طرح اپنے جسم کے کسی حصہ مثلاً آنکھ کی وصیت بھی کر سکتا ہے کیونکہ مال اور جسم اس لحاظ سے ایک دوسرے کے مماثل اور مشابہ ہیں کہ دونوں سے انسان کو فائدہ پہنچتا اور دونوں پر انسان کی ملکیت قائم ہوتی ہے اور دونوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہر ایسے تصرف کا اختیار دیا ہے جو اُس کے لئے دنیا و آخرت میں مفید اور نفع بخش ہو۔

ایک مسلمان کو اپنے مال کے اندر جن تصرفات کا اختیار دیا گیا ہے ان میں سے ایک یہ کہ وہ اپنے مال کے ایک حصہ کے متعلق وصیت کر سکتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد یہ مال فلاں شخص کو دے دیا یا رفاہِ عام کے فلاں کام میں صرف کر دیا جائے، چونکہ اس سے ایک یا ایک سے زیادہ ایسے انسانوں کو فائدہ پہنچتا ہے جنہیں قانون وراثت کی رو سے مرنے والے کے مال سے کچھ نہیں ملتا لہذا انسانی ہمدردی اور بھلائی کی وجہ سے اُسے مستحب اور واجب ٹھہرایا گیا ہے، گویا مالی وصیت کے جواز کی علت انسانی بھلائی و ہمدردی ہے۔ اور چونکہ یہی علت آنکھوں کی وصیت میں بھی پائی جاتی ہے اس سے بھی ایک ضرورتمند انسان کی ضرورت پوری ہوتی اور ایک نابینا کو بینائی ملتی ہے جو انسانی بھلائی اور ہمدردی کی ایک عمدہ شکل ہے لہذا یہ بھی اسی طرح جائز ہونی چاہیئے جس طرح مال کی وصیت جائز ہے۔

مزید برآں صحیح البخاری اور صحیح المسلم میں ایک حدیث بھی ایسی ملتی ہے جو جسم و جان کے متعلق وصیت کے جواز پر دلالت کرتی ہے وہ حدیث اس طرح ہے:۔

عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ ذکر رجلا فیمن کان قبلکم اعطاہ اللہ مالا و ولدا، فلما حضرت الوفاۃ قال لبنیہ ایُّ اب کنت لکم قالوا خیر اَب، قال فانہ لم یبتئر عند اللہ خیرا، وان یقدر اللہ علیہ یعذبہ فانظروا اذا مت فاحرقونی حتیٰ اذا صرت فحما فاسحقونی، فاذا کان یوم ریح عاصف فاذرونی فیہا فقال النبی

صلی اللہ علیہ وسلم فاخذ مواثیقہم علی ذالک وربی ففعلوا، فقال اللہ کن فاذا رجل قائم، ثم قال ای عبدی ما حملک علی ما فعلت؟ قال مخافتک، فما تلافاہ ان رحمہ، وفی روایۃ فغفرلہ۔ کتاب الرقاق وکتاب التوحید فی البخاری وکتاب التوبۃ فی المسلم۔

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو تم سے پہلے لوگوں میں تھا اور اُسے اللہ نے مال بھی عطا فرمایا تھا اور اولاد بھی، جب اس کی موت کا وقت آیا تو اُس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا بتلاؤ میں تمہارے لئے کیسا باپ رہا تو انہوں نے جواب دیا بہت اچھا باپ، پھر اس نے کہا کہ میں اللہ کے پاس نیکیوں کا ذخیرہ نہیں کر سکا ہوں لہٰذا مجھے ڈر ہے کہ اللہ مجھے عذاب دے گا، پس دیکھو جب میں مر جاؤں تو میری لاش کو جلانا یہاں تک کہ وہ کوئلہ بن جائے پھر اس کو پیسنا اور جس دن زور کی آندھی ہو اس میں اُسے بکھیر دینا اور اس پر اُس نے ان سے حلفیہ پختہ عہد و پیمان لیا چنانچہ اس کے مرنے کے بعد انہوں نے ایسا ہی کیا، پس اللہ نے لفظ کُن فرمایا تو وہ ایک مرد کی شکل میں کھڑا ہو گیا، پھر اللہ نے اس سے پوچھا اے میرے بندے بتلا کس چیز نے تجھے اُس فعل پر آمادہ کیا جو تو نے کیا، تو اس نے جواب دیا آپ کے خوف نے، پس اللہ نے اس کی تلافی اس طرح فرمائی کہ اس پر رحم فرمایا اور اُسے بخش دیا۔

اس حدیث نبوی سے جن امور پر روشنی پڑتی ہے اُن میں سے ایک یہ کہ انسان اپنے مردہ جسم کے متعلق ایسی وصیت بھی کر سکتا ہے کہ اس کو جلا کر اُس کی راکھ ہوا میں اڑا اور دریا میں بہا دی جائے، اگر ایسی وصیت کسی صورت میں بھی جائز نہ ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس وصیت کا ذکر فرمایا تو اس کے ساتھ یہ بھی ضرور فرماتے کہ ایسی وصیت کسی حال میں کسی کے لئے جائز نہیں، غرضیکہ اس موقع پر آپ کا کچھ نہ فرمانا ایسی وصیت کے جواز کی دلیل بن سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام کی اصل تعلیم یہی ہے کہ جب کوئی مسلمان مر جائے تو زندہ لوگ قبر کھود کر اُسے زمین میں دفن کریں، بحری سفر میں مر جائے تو سمندر میں ڈال دیں تاکہ وہ اُس ضرر سے بچ جائیں جو لاش کے سڑنے اور تعفن پھیلنے سے زندہ لوگوں کو پہنچتا ہے۔ بہر حال مسلمان کی لاش کو جلانا، اس بارے میں اسلامی تعلیم کے خلاف ہے جس طرح یہ خلاف ہے کہ اُسے ممی اور حنوط کر کے قبر میں دفن کیا جائے جیسا کہ قدیم مصر وغیرہ میں ہوا کرتا

تھا تاکہ لاش صحیح و سالم رہے اور اُسے کوئی کیڑا وغیرہ نہ کھائے، گویا اسلام نہ تو ہندو مذہب کی طرح اس کے حق میں ہے کہ مردہ کو آگ میں جلا کر ختم کر دیا جائے اور نہ قدیم مصری مذہب کی طرح اس کے حق میں کہ میت کو ممی کر کے محفوظ کر دیا جائے بلکہ وہ اُسے زمین میں دفن کر دینے کے حق میں ہے جس کی ایک شکل سمندر میں ڈال دینا ہے جب موت سمندری سفر میں واقع ہوئی ہو۔

اور پھر جیسا کہ عام مشاہدہ ہے مذکورہ دونوں شکلوں میں قبر میں دفن کرنے کی شکل میں بھی اور دریا میں ڈال دینے کی شکل میں بھی میّت بالآخر تحلیل ہو کر ختم ہو جاتا ہے لہٰذا اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ میّت جوں کا توں صحیح سالم رہے بلکہ یہ چاہتا ہے کہ وہ تحلیل ہو کر رفتہ رفتہ ختم ہو جائے جن ارضی عناصر سے وہ بنا تھا پھر انہی عناصر میں بکھر جائے۔

غالباً اسی چیز کے پیشِ نظر بعض اسلامی ممالک جیسے مصر وغیرہ میں اب یہ ہونے لگا ہے کہ جگہ کی کمی کی وجہ سے ہر ہر مردے کو الگ الگ قبر میں دفن کرنے کی بجائے، بہت سے مردوں کو تجہیز و تکفین کے بعد قبرستان میں بنے ہوئے تہہ خانوں میں ایک ساتھ رکھ کر اُن پہ کوئی کیمیاوی دوا چھڑک دی جاتی ہے جس سے وہ جلد تحلیل ہو کر ختم ہو جاتے ہیں اور پھر ان کے ڈھانچوں کو دوسری جگہ محفوظ کر دیا جاتا ہے۔

بہرحال اور جو کچھ بھی ہو لیکن اسلام میں مُردے کو جلانے کا طریقہ ناجائز ہے لہٰذا ایک مسلمان نہ ایسی وصیّت کر سکتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اُس کی لاش کو جلا دیا جائے اور نہ زندوں کے لئے ایسی وصیّت پہ عمل کرنا جائز ہے کیونکہ یہ اسلامی طریقہ کے سراسر خلاف ہے اور اس میں زندہ انسانوں کا کچھ فائدہ بھی نہیں۔

غرضیکہ مذکورہ حدیث سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انسان اپنے جسم کا مالک ہے اور اس کے متعلق وصیّت کر سکتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اسلام کی رو سے وہ کیسی وصیّت کر سکتا اور کیسی نہیں کر سکتا اور کیسی وصیّت پہ عمل کرنا جائز ہے اور کیسی پہ عمل کرنا جائز نہیں۔

اور چونکہ ایک مسلمان کی ایسی وصیّت کہ میرے مرنے کے بعد میری آنکھیں کسی نابینا کے لئے نکال کر پھر مجھے اسلامی طریقہ سے دفن کر دیا جائے جہاں اسلامی طریقۂ تدفین کے خلاف نہیں وہاں اس میں ایک ضرورتمند نابینا انسان کا کھلا ہوا فائدہ بھی ہے لہٰذا ایسی وصیت کو حرام اور ناجائز کہنا صحیح نہیں ہو سکتا

تیسری دلیل اُن علماء کرام کی جو قرنیہ کی پیوند کاری کو حرام اور ناجائز کہتے ہیں یہ کہ اس سے ایک مسلمان کے جسم میں پاک اور ناپاک کا اختلاط واقع ہوتا ہے وہ اس طرح کہ مردہ جسم ناپاک ہے لہٰذا اس سے اخذ کی ہوئی آنکھ بھی ناپاک ہوتی ہے وہ آنکھ جب زندہ انسان کو لگائی جائے گی تو اس کے جسم میں ایک مردہ و ناپاک چیز شامل ہو جائے گی۔ اب ایسا آدمی جو نماز پڑھے گا وہ صحیح نہیں ہوگی اس لئے کہ نماز کی صحت کے لئے پورے جسم کا پاک ہونا ضروری ہے۔ اس کی تائید میں وہ بعض فقہاء کا یہ قول پیش کرتے ہیں کہ اپنے گرے ہوئے یا مردہ کے دانت کو لگانا ناجائز ہے اس کے ساتھ جو نماز پڑھی جاتی ہے درست نہیں ہوتی۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ دلیل بھی اُس مطلب کے لئے مفید اور کارگر نظر نہیں آتی جس کے ثبوت میں یہ پیش کی گئی ہے بلکہ یہ دلیل مسئلہ زیر بحث سے غیر متعلق دکھائی دیتی ہے اس لئے مسئلہ زیر بحث میں مردہ اور زندہ اور پاک اور ناپاک کا اختلاط ہوتا ہی نہیں بلکہ زندہ کا زندہ اور پاک کا پاک سے اختلاط ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ کہ آدمی جب مرتا ہے تو اُس کے جسم کے تمام اجزاء ایک ساتھ فوراً نہیں مر جاتے بلکہ بعض اعضاء پہلے مرتے اور بعض کچھ دیر میں مرتے ہیں یعنی بعض اعضاء سے زندگی مرتے ہی فوراً ختم ہو جاتی اور بعض سے تین تا چھ گھنٹے کے بعد ختم ہوتی ہے آنکھوں میں کم از کم تین گھنٹے تک زندگی رہتی ہے چنانچہ اس وقفہ میں نکال کر محفوظ کر لی جاتی ہیں وہی زندہ آدمی کا جزء بنتی اور اُسے فائدہ پہنچاتی ہیں، اور جو آنکھیں بالکل مر جاتی ہیں وہ نہ زندہ جسم میں جڑ سکتی ہیں اور نہ اُن سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے بلکہ اُلٹا ضرر اور نقصان پہنچتا ہے۔

اور چونکہ زیر بحث قرنیہ کی پیوند کاری زندہ آنکھ کی قرنیہ سے ہوتی ہے لہٰذا آپریشن کامیاب ہونے کے بعد زندہ کا زندہ سے جوڑ ہوتا ہے مردہ کا زندہ سے جوڑ نہیں ہوتا، جب مردہ کا زندہ سے جوڑ نہیں ہوتا تو ناپاک اور پاک کا اختلاط بھی نہیں ہوتا، جب اختلاط نہیں ہوتا تو نماز پر بھی کوئی اثر نہیں پڑتا۔

رہا دانت کا مسئلہ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ اگر بعض فقہاء اس کے عدم جواز کے قائل ہیں تو دوسرے بعض اس کے جواز کے بھی قائل ہیں جیسے قاضی ابو یوسف کہ ان کے نزدیک گرے ہوئے دانت کا دوبارہ لگانا بھی جائز ہے اور اس دانت کے ساتھ نماز بھی صحیح رہتی ہے۔

علاوہ ازیں دانت کے مسئلہ پہ آنکھ کو قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ گرا ہوا دانت بے حس ہو جاتا ہے اُسے دوبارہ لگانے سے اُس میں وہ حِس واپس نہیں لوٹتی جو گرنے سے پہلے اُس کے اندر پائی جاتی تھی لہٰذا وہ مردہ کے حکم میں ہوتا ہے، بخلاف آنکھ کے کہ وہ علیحدہ ہونے کے بعد بھی زندہ رہتی اور دوسرے جسم میں جڑنے پہ وہی کام کرتی ہے جو پہلے جسم میں کرتی تھی لہٰذا ایک کا دوسرے پہ قیاس درست نہیں۔

اور پھر یہ تیسری دلیل اس بنا پر بھی غلط قرار پاتی ہے کہ فقہاء کے نزدیک آدمی کے اجزاء سے فائدہ اٹھانا نجاست کی وجہ سے نہیں بلکہ آدمی کی کرامت اور بزرگی کی وجہ سے ہے، ھدایہ کی عبارت ہے۔ حرمۃ الانتفاع باجزاء الآدمی لکرامتہ۔ آدمی کے اجزاء سے نفع اٹھانے کی حرمت اس کی کرامت و تکریم کی وجہ سے ہے۔ فتاویٰ عالمگیری کی عبارت ہے: الانتفاع باجزاء الآدمی لم یجز قیل للنجاسۃ وقیل لکرامۃ ھو الصحیح۔ آدمی کے اجزاء سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ایک قول میں نجاست کی وجہ سے اور دوسرے قول میں کرامت کی وجہ سے اور یہ دوسرا قول ہی صحیح ہے۔

یہ ہے ایک علمی تجزیہ اور تحقیقی جائزہ اُن تین دلائل کا جن کی بنیاد پہ قرنیہ کی پیوندکاری کو حرام و ناجائز کہا گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں اس کی روشنی میں اس فتوے کی صحت و عدم صحت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو مسئلہ مذکورہ کے متعلق عدم جواز کا دیا گیا ہے۔

اب میں مختصر طور پہ اُن دلائل کو پیش کرنا اور اُن پہ کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جو قرنیہ کی پیوندکاری کے جواز میں لکھے گئے اور اب تک سامنے آئے ہیں، یہ دلائل بھی منصوص دلائل نہیں بلکہ پہلے دلائل کی طرح قیاسی اور اجتہادی دلائل ہیں۔

قرنیہ کی پیوندکاری کو جائز کہنے والے علماء اپنی دلیل کو اس طرح شروع کرتے ہیں: اسلام نے اپنی تعلیمات میں جن چیزوں کو بطور مقاصد سامنے رکھا ہے اُن میں سے ایک چیز انسان کی جسمانی صحت ہے، اور یہ اس لئے کہ بہت سے ایسے فرائض ہیں جن کی آدائیگی اور انجام دہی کا دارومدار جسمانی صحت و تندرستی پہ ہے اور جن کی آدائیگی انسان کی انفرادی اور اجتماعی فلاح و کامیابی کے لئے ضروری ہے۔

چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر اسلام نے مضر صحت اشیاء کو حرام اور مفید صحت چیزوں کو حلال ٹھہرایا ہے

اور اسی مقصد کی خاطر مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ ہر بیماری کا ضرور علاج کریں کرائیں کیونکہ بیماریوں سے جسمانی صحت ضرور بگڑتی اور خراب ہوتی اور فرائض کی ادائیگی پر اس کا اثر پڑتا ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو علاج معالجے کا حکم دیتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ ہر مرض کا علاج ہے اور ہو سکتا ہے لہٰذا کبھی مایوس نہ ہونا چاہیئے ۔

اور پھر چونکہ یہ ظاہر ہے کہ بیماریوں کے علاج معالجے کی ضرورت صرف اُسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب وہ طور طریقے مباح اور وہ اشیاء جائز ہوں جن کو اختیار اور استعمال کئے بغیر علاج معالجہ نہیں ہو سکتا لہٰذا اسلام کے نزدیک وہ تمام طور طریقے جائز ٹھہرتے اور سب اشیاء مباح قرار پاتی ہیں جن پر علاج معالجے کا دار و مدار اور تمام تر انحصار ہوتا ہے اور اطباء انہیں ضروریات کا درجہ دیتے ہیں ۔ اگرچہ اُن میں سے بعض اشیاء کسی دوسری وجہ سے ناجائز ہی کیوں نہ ہوں ۔

جسمانی بیماریوں میں سے ایک بیماری اندھے پن اور بینائی کھو جانے کی بیماری ہے جس کا مجرب اور کامیاب علاج اب تک جو معلوم ہو سکا ہے وہ یہ کہ مردہ آدمی کی آنکھ کی قرنیہ جب اندھے آدمی کی آنکھ میں پیوست کر دی جاتی ہے تو اُس کا اندھا پن دور ہو جاتا اور وہ اپنی آنکھ سے دیکھنے لگتا ہے دنیا میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں جو ہر ملک میں دیکھی جا سکتی ہیں اور جو اس طریقہ علاج کی کامیابی کا روشن ثبوت ہیں لیکن مردے آدمی کی آنکھیں اخذ کرنا اس لحاظ سے ناجائز بھی ہے کہ اس سے مردے کی ہتک اور توہین ہوتی اور تکریم آدمیت کو دھچکا لگتا ہے، لہٰذا یہاں ایک مشکل مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے وہ یہ کہ نابینا آدمی کی ضرورت کے لئے مردہ آدمی کی آنکھ اخذ کرنا شرعاً جائز ہے یا جائز نہیں ؟ اس کے لئے جب ہم قرآن و حدیث اور کتب فقہ و فتاویٰ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں جزوی و تفصیلی طور پر کوئی واضح ہدایت نہیں ملتی البتہ کتب فقہ میں قرآن و حدیث سے ماخوذ کچھ ایسے قواعد کلیہ اور اصول عامہ ضرور ملتے ہیں جن کی روشنی میں اس جزوی مسئلہ کو بخوبی حل کیا جا سکتا ہے ۔

مثلاً اُن قواعد کلیہ میں سے ایک قاعدہ یہ ہے "کہ ضرورت محظور و ممنوع چیز کو مباح کر دیتی ہے ۔"

دوسرا قاعدہ یہ کہ "جب دو برائیاں پیش آئیں تو بڑی برائی سے بچنے کے لئے چھوٹی برائی کو اختیار کرنا جائز ہے

تیسرا قاعدہ یہ کہ بڑے فائدہ کی خاطر چھوٹے فائدے کو چھوڑ دینا جائز ہے"۔ اور چوتھا قاعدہ یہ کہ "جس چیز میں ایک پہلو مضرت کا اور دوسرا پہلو منفعت کا ہو، تو اگر مضرت کا پہلو غالب یا برابر ہو تو اس چیز سے اجتناب کیا جائے اور منفعت کا پہلو غالب ہو تو اُسے اختیار کیا جائے"۔

غور سے دیکھا جائے تو ان چاروں قواعد کلیہ کی رو سے مسئلہ مذکور کا حل یہ نکلتا ہے کہ اندھے آدمی کی بینائی کے لئے مردہ آدمی کی آنکھیں اخذ کرنا جائز ہے :

پہلے قاعدے کی رو سے اس طرح کہ چونکہ اندھے پن کا علاج بلاشک اندھے آدمی کی ایسی ضرورت ہے جو بغیر اس کے پوری نہیں ہو سکتی کہ مردہ آدمی کی آنکھیں استعمال کی جائیں لہٰذا اس ضرورت کے تحت وہ محظور اور حرام عمل مباح اور جائز ہو جاتا ہے جو مردہ آدمی کی آنکھیں لینے میں کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ پہلے قاعدہ کے مطابق ضرورت، حرام و محظور چیز کو مباح بنا دیتی ہے۔

دوسرے قاعدے کی رو سے اس طرح کہ باوجود اندھے پن کا علاج ہو سکنے کے اندھے کو علاج سے محروم رکھنا، ایک برائی ہے اور اس علاج کے لئے مردہ آدمی کی آنکھیں اخذ کرنا دوسری برائی ہے اور چونکہ پہلی برائی میں زندہ آدمی کا ضرر اور دوسری برائی میں مردہ آدمی کا ضرر ہے لہٰذا پہلی برائی دوسری برائی سے زیادہ اور شدید ہے بنا بریں پہلی برائی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے دوسری برائی کو اختیار کرنا دوسرے قاعدہ کے تحت جائز قرار پاتا ہے۔

تیسرے قاعدہ کی رو سے یوں کہ تکریم آدمیت کی وجہ سے مردہ آدمی کی آنکھیں نہ لینا ایک اچھائی ہے اور اندھے آدمی کو بینائی سے بہرہ ور کرنا دوسری اچھائی ہے لیکن چونکہ پہلی اچھائی کا تعلق مردہ آدمی سے اور دوسری اچھائی کا تعلق زندہ آدمی سے ہے لہٰذا دوسری اچھائی کو پہلی اچھائی پر فوقیت و برتری حاصل ہے تو پھر تیسرے قاعدہ کے تحت پہلی اچھائی کو دوسری اچھائی کی خاطر چھوڑ دینا جائز ٹھہرتا ہے۔

چوتھے قاعدے کی رو سے اس طرح کہ مردہ آدمی کی آنکھیں اخذ کرنے میں ایک پہلو مضرت کا ہے اور دوسرا منفعت کا۔ مضرت کا پہلو یہ کہ اس سے انسان کی لاش کی ہتک اور توہین ہوتی ہے۔ اور منفعت

کا پہلو یہ کہ اس سے ایک اندھے نابینا آدمی کو بینائی ملتی ہے، پھر جب ان دونوں پہلوؤں پر یہ دیکھنے کے لئے غور کیا جاتا ہے کہ کونسا پہلو غالب اور کون سا مغلوب ہے تو منفعت کا پہلو غالب اور مضرت کا پہلو مغلوب نظر آتا ہے لہذا چوتھے قاعدہ کے تحت نابینا آدمی کی بینائی کی خاطر مردہ آدمی کی آنکھیں لینے کا جواز پیدا ہو جاتا ہے ۔

یہ حضرات اپنے مؤقف کی تائید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو بھی پیش کرتے ہیں ۔

مثل المومنین فی توادھم وتراحمھم وتعاطفھم کالجسد الواحد ، باہمی دوستی ہمدردی اور شفقت میں مومنوں کا حال ایک جسم کے اعضاء جیسا ہے ۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس حدیث کے وسیع مفہوم میں ایک صورت یہ بھی داخل ہے کہ وہ مردہ کے کسی عضو سے زندہ کو فائدہ پہنچے لیکن ان حضرات کی یہ دلیل کافی کمزور ہے ، البتہ مذکورہ بالا قیاسی دلائل وزنی اور جاندار ہیں اور ان پہ اعتماد کیا جا سکتا ہے ۔

آخر میں اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ اس مسئلہ میں تیری رائے کیا ہے تو میں اُس کا جواب یہ دوں گا کہ چونکہ مجھے اس مسئلہ کے متعلق باوجود جستجو اور تحقیق کے قرآن و حدیث میں کوئی ایسی نص نہیں مل سکی جس سے عبارةً ، دلالةً ، اقتضاءً اور اشارةً یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرنیہ کی پیوندکاری واجب ہے یا حرام ، بالفظ دیگر مجھے اس مسئلہ کے متعلق قرآن و حدیث میں نہ تو بصورت امر کوئی ایجابی حکم مل سکا ہے اور نہ بصورت نہی کوئی امتناعی حکم، نہ تفصیلاً اور صراحةً ملا ہے اور نہ اجمالاً اور قیاساً ، لہذا میری رائے میں قرنیہ کی پیوندکاری نہ واجب ہے اور نہ حرام، بلکہ اسے صرف مباح ہی سمجھا جا سکتا ہے ، جس کے نہ اختیار کرنے میں کوئی حرج ہوتا ہے اور نہ ترک کرنے میں کوئی حرج ، یعنی جس کا ترک و اختیار دونوں جائز ہوتے ہیں ، نہ ترک کرنے والے کو گنہگار کہہ سکتے ہیں اور نہ اختیار کرنے والے کو گنہگار ۔

علماء محققین نے لکھا ہے کہ اصل اشیاء کے اندر اباحت ہے کسی شے کو شرعاً واجب یا

حرام اُس وقت تک نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ اس کے واجب یا حرام ہونے پر کوئی شرعی دلیل قائم نہ ہو، اور چونکہ یہ مسئلہ بھی ایسا ہی ہے لہذا نہ اس کو واجب کہنا درست ہو سکتا ہے اور نہ حرام کہنا درست۔

ختم کر دینے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مسئلہ زیر بحث کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے نہ کسی کی مخالفت اور تردید مقصود ہے اور نہ کسی کی موافقت و تائید مقصود، مقصود صرف یہ کہ اس عالمگیر انسانی مسئلہ کے متعلق اسلام کا مؤقف واضح ہو جو ایک خود عالمگیر انسانی دین ہے۔ اور پھر جو کچھ لکھا ہے اپنے علم و فہم کے مطابق طالبعلمانہ انداز سے لکھا ہے جو صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی، یہ کسی دارالافتاء کا فتویٰ نہیں اور نہ سپریم کورٹ کا فیصلہ، بلکہ یہ ایک جویائے حق کی علمی کاوش ہے یہ صحیح ہے یا غلط یا کس حد تک صحیح ہے اور کس حد تک غلط؟ اس کا فیصلہ غیر متعصب، منصف مزاج اور حقیقت پسند اہل علم و فکر ہی کر سکتے ہیں۔